بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

تبدیلیٔ قیادت یا اصلاح حال اور طرزِ عمل

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

انسان عموماً کسی عمل کے اچھے نتائج اور کامیابی کو اپنے زورِ بازو اور ہنرمندی کا نتیجہ سمجھتا ہے اور ناکامی کو اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تصور کرتے ہوئے صبر کی طرف مائل ہوتا ہے، جب کہ قرآن کریم، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے رحم و کرم اور انسان کی بھلائی کے حوالے سے یہ اصول بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحمت وشفقت کو اپنے اوپر فرض کر چکا ہے۔ چنانچہ خرابی، ظلم وفساد اور غارت گری کے واقع ہونے میں بنیادی طور پر انسان کی اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کا دخل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس سلسلے میں یہ قیمتی اصول بیان کیا ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ (الشوریٰ ۴۲:۳۰) تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔

یہ اس لیے کہ ربِّ کریم نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا۔ اپنے بندوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالتا اور ہمیشہ اپنے بندوں پر رحم و کرم کی بارش کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اس کے کرم کی کوئی انتہا نہیں ؎

کرم ہی سے تیرے پھولوں سے دامن بھر گیا میرا
کرم ہی سے تیرے کچھ اور گنجائش نکل آئی

اس لیے اگر کسی معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی، قید و بند اور تعذیب، پکڑ دھکڑ اور زباں بندی اور افواہ سازی کا دور دورہ ہو اور حق وانصاف کی آواز بلند کرنے والوں اور حق وانصاف کے لیے نکلنے والوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہو، تو صرف ظالم کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا

کافی نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ شہادتِ حق کا تقاضا ہے کہ احتسابِ نفس کرتے ہوئے دیکھا جائے کہ ظلم کے غالب آنے میں خود مظلوموں کی اپنی کوتاہی و پسپائی کا کتنا دخل ہے؟ یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر شہادت حق اور امر بالمعروف کا فریضہ مؤثر انداز میں ادا نہ کیا جائے تو معاشرے میں جو اخلاقی خلا پیدا ہوگا، اسے ابلیسی قوتیں ہی پُر کریں گی۔ گویا استقامت سے ہٹ کر اپنے فرائض و واجبات کو ادا نہ کرنا فطری طور پر ظلم اور ناانصافی کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے، کیوں کہ ابلیسی قوتیں ہمیشہ اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کہیں سے کوئی خلا ملے اور وہ اس میں گھس کر ظلم و فساد برپا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے برعکس اگر غیر متزلزل طور پر استقامت کے ساتھ حق کی شہادت ادا کی جائے تو تاریخ گواہ ہے کہ ظلم، جبر اور مکر کی تمام چالیں آخر کار ناکام ہوجاتی ہیں اور اللہ ربّ العزت کی تدبیر ہی غالب آکر رہتی ہے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝ (اٰل عمرٰن ۳: ۵۴) ''اور انھوں نے خفیہ چالیں چلیں تو اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا۔ اور اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے''۔

ملک عزیز میں ایک عرصہ سے یہ ایک علمی بحث کی جارہی ہے کہ ایک عادل ڈکٹیٹر اور عوام کے ایک منتخب کردہ لیکن بدعنوان شخص دونوں میں افضل کون ہے؟ اول الذکر کا نقص مطلق العنان ہونا ہے جو قرآن و سنت کے منافی ہے، جب کہ آخر الذکر کو اگرچہ نام نہاد لبرل جمہوری انتخابات میں کامیابی ہوئی ہے لیکن وہ بدعنوانی کے لیے معروف ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نام نہاد جمہوریت، اسلامی ریاست کی روح کے منافی ہے۔ یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں ہے کہ فوجی حکمران ہو یا 'عوامی ووٹ' سے برسر اقتدار آنے والا سربراہ، ماضی میں دونوں عوام کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اگر کسی چیز میں کامیاب رہے ہیں، تو وہ مہنگائی، بے روزگاری، عدم تحفظ کو بڑھانا اور معاشرے میں ناانصافی اور ظلم کو فروغ دینا ہے۔ گویا اگر انتخاب کیا بھی جائے تو ایک طرف گڑھا ہے اور دوسری طرف کھائی۔

اس صورتِ حال میں کیا چوکیدار کی تبدیلی سے حالات میں بہتری ہوسکتی ہے؟ کیا ایسے حالات میں نااُمید ہوکر ایک ہچکولے کھاتی کشتی کے بادبان سے ہاتھ کھینچ کر اسے ہوا اور پانی کی موجوں پر چھوڑ دیا جائے یا بادِ مخالف کو بادبان کا رُخ موڑ کر منزل کی طرف جانے کا ذریعہ بنایا جائے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جو ہر محب وطن کو درپیش ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ کشتی کو ہوا اور موجوں پر

چھوڑ دیا جائے، جہاں اللہ کی مرضی ہو چلی جائے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ اس حدیث کی روشنی میں جس میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ ایک دومنزلہ کشتی میں سفر کیا جا رہا ہو اور نچلی منزل والے پانی کے حصول کے لیے کشتی کے تلے میں سوراخ کر رہے ہوں اور اوپر کی منزل والے، اگر انھیں اس کام سے نہ روکیں گے تو دونوں منزلوں والے کشتی کے ساتھ غرق ہوں گے۔ اس لیے ان ناسمجھ افراد کو سوراخ کرنے سے روکنا دوسروں پر فرض ہوگا۔

اس حدیث میں یہ سبق ہے کہ تماش بین بن کر کشتی کو ناسمجھ لوگوں کے حوالے کر دینا دین کے منشا کے منافی ہے۔ جس کشتی میں آج پاکستانی قوم سوار ہے، اس پر جن ملاحوں کا قبضہ ہے وہ خود ہی کشتی میں سوراخ کرنے میں لگے ہیں۔ اس وقت اس بحث سے قطع نظر کہ کشتی لکڑی سے بنی ہے یا لوہے سے، پہلے کشتی کو ڈوبنے سے بچانا عقلی تقاضا ہے۔ اس کے بعد یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ کشتی کی ساخت میں کیا تبدیلی کی جائے اور اسے کس طرح مکمل طور پر اسلام کے ابدی اصولوں سے ہم آہنگ کیا جائے؟

اس سوال کا آسان اور مختصر جواب جس کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہے کہ اصل حل تو یہی ہے کہ اسلام کے دیے ہوئے جامع اور کامل نظامِ حیات کو نافذ کیا جائے، کیونکہ ربِّ کریم نے اس نظام کو بھلائی اور نیکیوں کی بنیاد پر عدل اور حق کے تقاضوں کے پیش نظر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مدینہ کی فلاحی ریاست کی شکل میں جاری کروا کر اس کی عملیت اور جامعیت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ لیکن کیا یہ نفاذِ نظامِ اسلامی صرف نیک خواہشات اور مطالبات کے ذریعے ہوجائے گا؟ یا پھر اس کے لیے پہلے قوم کو اپنے نصب العین کا واضح تعین کرنے کے ساتھ، حصول نصب العین کے لیے بنیادی ایمانی، انسانی اور مادی وسائل کی تیاری اور فراہمی اور ماحول کی سازگاری کو واضح حکمت عملی اور مستقل مزاجی اور استقامت کے ساتھ قائم کرنے کی جدوجہد کرنی ہوگی؟ ایسے افرادِ کار تیار کرنے ہوں گے جو بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ اپنی ہر شے اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے لگانے پر آمادہ ہوں۔ تحریک اسلامی نے اس مسئلے کے حل کے لیے جو راستہ سوچ سمجھ کر منتخب کیا ہے وہ اقامت دین کے ذریعے اصلاح حال اور تبدیلیٔ نظام کا واضح نقشہ ہے۔ یہاں یہ بحث لاحاصل ہے کہ پہلے اوپر سے نظام تبدیل ہو یا مضبوط بنیادوں پر

ایک ایک اینٹ رکھ کر حصولِ مقصد کی جدوجہد اختیار کی جائے، یا بیک وقت دونوں کام کیے جائیں؟

حصول مقصد کے لیے تدبیر اور حکمت عملی جب تک زمینی حقائق کی بنیاد پر نہیں بنے گی، کامیابی نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ بات ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جو بھی حکمت عملی اختیار کی جائے اس کی بنیاد صرف قرآن اور سنت کو ہونا چاہیے۔ کامیابی کا انحصار نصب العین کے واضح ہونے کے ساتھ صحیح اور بروقت حکمت عملی کے اختیار کرنے پر ہے۔ نظامِ ظلم کی جگہ نظامِ عدل کا قیام استقامت، صبر اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی توفیق اور نصرت کے ساتھ مشروط ہے۔

تصورِ شریعت

اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے عوام الناس کے ذہنوں سے شریعت کے بارے میں ایک بے بنیاد اور منتشر الخیال تصورِ شریعت کو دُور کرنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر ان کے ذہن میں شریعت کے نفاذ کا مفہوم واضح شکل اختیار کر سکے اور وہ ایک روایتی اور محدود تصورِ شریعت سے نجات حاصل کرسکیں۔ اس گئے گزرے ماحول میں بھی ایک پڑھا لکھا شہری ہو یا ایک دیہاتی، اگر اس سے پوچھا جائے کہ جس اخلاقی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی بحران میں ملک وملت مبتلا ہیں اس سے کس طرح نکلا جا سکتا ہے؟ تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا کہ اس کا حل نہ سرمایہ دارانہ معیشت وسیاست میں ہے، نہ اشتراکی تصورِ حیات میں، دنیا ان دونوں نظاموں کے تباہ کن نتائج کو بھگت رہی ہے۔ دونوں نظام مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ لادینیت مشرق ومغرب میں کسی مسئلے کو حل نہیں کرسکی۔ اس لیے اسلام کے عالم گیر اور آزمودہ نظامِ شریعت کا نفاذ ہی مسائل کا واحد حل ہے۔ لیکن اگر اگلا سوال یہ کیا جائے کہ شریعت کے نفاذ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ عموماً جواب ملتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنا اور کسی کو بدنام کرنے والے یا افواہ سازی کرنے والے کو کوڑے مارنے اور کسی اخلاقی مجرم کو سنگسار کرنے کا نام شریعت کا نفاذ ہے۔ اگر مزید سوال کیا جائے کہ کیا صرف ان سزاؤں کے نفاذ سے نظام میں اصلاح ہو جائے گی؟ تو عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ آخر دورِ خلافت میں شریعت کے نفاذ نے امن و امان، تحفظ اور معاشی خوش حالی دی تھی، اس لیے آج بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ یہ بات درست ہے لیکن ہمارے خیال میں اس میں مزید گہرائی میں جا کر عقلی دلائل کے ساتھ شریعت کے مجموعی مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

نفاذِ شریعت کا مفہوم

تحریک اسلامی تبدیلیٔ نظام کو اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے ساتھ مشروط کرتی ہے۔ گویا نہ صرف قانون بلکہ تمام ریاستی نظام کو وہ تعلیم ہو یا معیشت و سیاست اور ثقافت، ہر شعبہ کو اسلامی اخلاقی اصولوں کا تابع کیا جانا شریعت کا نفاذ ہے۔ لیکن عوام الناس کا تصورِ نفاذِ شریعت اور تحریک اسلامی کا تصورِ نفاذِ شریعت عملاً ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جس کی بنا پر ایک وسیع ابلاغی خلا مستقلاً موجود رہتا ہے اور اس فرق کو دُور کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ کسی بھی مسلم ملک میں عوامی رائے معلوم کی جائے تو نفاذِ شریعت کا مطلب حدود کا نفاذ ہی لیا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی ایک زمانے میں اسلامی نظام کے قیام کے نعرے کے تحت حدود آرڈیننس جاری کر کے یہ تصور دیا گیا کہ ایک فوجی حکومت نے عوامی خواہش کے احترام میں یہ اقدام اٹھایا ہے۔

اس تصورِ نفاذِ شریعت نے نہ صرف اسلام کے سیاسی استعمال کے تصور کو فروغ دیا بلکہ وسیع پیمانے پر اسلامی شریعت اور حدود کے نفاذ کے نعرے کو یکساں تصور کیا جانے لگا۔ ساتھ ہی ملک کے لبرل ابلاغ عامہ اور بیرونی برقی ابلاغ خصوصاً بی بی سی نے دستاویزی فلمیں بنا کر یہ تاثر گہرا کر دیا کہ خواتین کو تعلیم سے محروم رکھنا، گھر میں قید کرنا اور اخلاقی جرائم کی سزا میں کوڑے مارنا اور چادر سے ڈھانک کر کلاشن کوف سے گولی مارنے اور سنگسار کرنے کا نام ہی نفاذِ شریعت ہے۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کیے گئے۔ ایک جانب اسلامی حدود کے نفاذ کو سفاکیت قرار دے کر اسلام دشمنی کی گئی اور دوسری جانب حدود کا نشانہ خواتین کو بنا کر عالم گیر پیمانہ پر مسلم دنیا میں خواتین کے ساتھ ظالمانہ رویے کے تصور کو ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا، جو شریعت کے بنیادی مقصد سے عدم آگاہی کا واضح ثبوت ہے۔ اس تصورِ شریعت کو مغربی ابلاغ عامہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دل کھول کر اس کی تشہیر کی گئی، حتیٰ کہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں بھی نفاذ شریعت کا خوف دل و دماغ میں سرایت کر گیا۔ تحریک اسلامی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موقف کو عام فہم انداز میں عوام کے سامنے رکھے اور اہل علم کے ذریعے پورے ملک میں سیمیناروں اور سماجی مجلسوں اور علمی نشستوں کے ذریعے نفاذِ اسلام کی مثبت اور جامع تصویر کو ذہنوں میں واضح کرے۔

دوسرے الفاظ میں نفاذِ شریعت کے مغربی ابلاغ عامہ کے قائم کردہ مسخ شدہ تصور کی جگہ

قرآن وسنت پر مبنی مثبت اور تعمیری تصور کو ہر سطح پر آسان زبان میں واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً شریعت کے سات معروف مقاصد یعنی • توحید • عدل • حفظِ نفس • حفظِ دین • حفظِ عقل • حفظِ نسل اور • حفظِ مال ہیں۔

انسانی جان کا تحفظ: شریعت کا اہم مقصد

ان میں ایک سب سے اہم مقصد انسانی جان کا تحفظ ہے۔ یعنی امن عامہ کی صورتِ حال کو اس درجہ بہتر بنا دیا جائے کہ گلیوں، بازاروں اور گھروں میں ہر فرد محفوظ و مامون ہو، کوئی کسی کو راہ چلتے گولی کا نشانہ نہ بنا سکے۔ کوئی راہ چلتے کسی فرد یا کاروبار میں مصروف کسی تاجر کو اسلحے کی نوک پر لوٹنے کا تصور بھی نہ کر سکے۔ خواتین، بچے اور معاشرے کے ہر طبقے کی جان و مال اور عزّت و آبرو کو بھرپور ریاستی تحفظ حاصل ہو۔ اسلامی شریعت کے انسانی جان کو تحفظ دینے اور انسانی حقوق کے حوالے سے نفاذِ شریعت کا یہ پہلو آج اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمانوں کی نگاہ سے بھی اوجھل ہے۔ اس کی جگہ نفاذِ شریعت کا تصور صرف پھانسی، کوڑے اور سنگسار کرنے کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔

انسانی جان کے تحفظ کے مقصدِ شریعت پر اگر ایک اور پہلو سے نگاہ ڈالی جائے تو بات زیادہ آسان ہو جائے گی یعنی انسانی جان کا تحفظ اس وقت ممکن ہے، جب عوام کو غذا اور فضا میں جراثیم، آلودگی اور ہر قسم کی ملاوٹ اور گندگی سے پاک، صاف و شفاف پانی، غذا اور ماحول فراہم کیا جائے۔ گویا نفاذِ شریعت کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف شہروں میں بلکہ گاؤں اور قصبوں میں بھی آلائشوں اور گرد آلود پانی کی جگہ صاف پانی و ہوا فراہم کی جائے، تاکہ عوام طرح طرح کی بیماریوں کے شکار نہ ہوں۔ انسانی جان کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب سڑکوں اور بازار میں جو انسان سانس لے رہے ہیں انھیں وہ ہوا میسر آئے جس میں کاربن اور دیگر گیسوں کی آمیزش اور مضر صحت اجزا موجود نہ ہوں۔ گویا ماحولیاتی آلودگی کا خاتمہ شریعت کے نفاذ کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

انسانی جان اسی وقت محفوظ ہو سکتی ہے، جب زندگی بچانے والی معیاری اور اصلی ادویات عوام کو مناسب نرخوں پر دستیاب ہوں۔ جعلی ادویات کی تیاری اور ان کی بازار میں فراہمی اور فروخت پر سخت پابندی ہو، چنانچہ ایسے افراد اور اداروں کے خلاف قانونی کاروائی مقاصد شریعت

کا ایک لازمہ ہے۔ گویا شریعت نافذ ہوگی تو سرکاری اداروں کو پوری قوت سے جعل سازوں کو نہ صرف جعلی ادویات کی تیاری سے روکنا ہوگا بلکہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یا گروہ اس مکروہ کاروبار میں ملوث پایا جائے تو عدل وانصاف کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے میں ایسے جعل ساز دشمنوں کو مثالی سزائیں دی جائیں گی۔ اس پہلو پر اگر درست طور پر عمل نہ کیا جارہا ہو اور جعلی ادویات کی تیاری و فروخت کی آزادی ہو، تو اس کا مطلب ہے کہ مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد چاہے کتنی ہی بڑھ جائے، اس کے باوجود شریعت نافذ نہیں ہوئی۔ انسانی جان کے تحفظ کے اصول اور مقصد کے جامع مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر شہری کو اس کی جسمانی ضرورت کے لحاظ سے نہ صرف معیاری غذا، شفاف پانی، معیاری ادویات اور آلودگی سے پاک ہوا کی فراہمی ممکن بنائی جائے بلکہ اس کی دیگر بنیادی ضروریات کو بھی ریاستی نگرانی میں پورا کیا جائے۔

انسانی جان کے تحفظ کا ایک بنیادی مطالبہ یہ بھی ہے کہ انسانوں کو دھوپ، گرمی، سردی، بارش اور دیگر ماحولیاتی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے لباس اور سر چھپانے کے لیے گھر میسر ہو۔ اس کے ساتھ انسان کی بنیادی ضرورت یہ علم ہے کہ کس چیز میں خیر ہے اور کس میں شر ہے، کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام؟ کیونکہ شریعت کا معروف اصول ہے کہ حلال اور طیب طور طریقے زندگی کو ترقی دیتے ہیں اور حرام اور خبیث اطوار زندگی کو نقصان پہنچاتے ہیں اور تباہ کرتے ہیں۔ گویا انسانوں کو معروف ومنکر کی تعلیم فراہم کرنا، حق وصداقت سے آگاہ کرنا، فسق وفجور کے تباہ کن اثرات سے خبردار کرنے کا نام نفاذِ شریعت ہے۔

ایک ریاست پانی، غذا، مکان، کاروبار، خاندانی زندگی فراہم کردے لیکن یہ نہ بتائے کہ کیا چیز اخلاقی اور قانونی طور پر جائز یا حلال اور کیا حرام ہے تو جان کا تحفظ کیسے ہوگا؟ کیا محض روٹی، کپڑا اور مکان دینا اور حلال وحرام ذرائع معیشت، سیاست، معاشرت اور ثقافت پر توجہ نہ دینے کا نام نفاذِ شریعت ہے؟ گویا جس شریعت کا نفاذ تحریک اسلامی چاہتی ہے، وہ قرآن وسنت کے دیے ہوئے اصولوں اور مقاصد کے مجموعے اور کُلی نفاذِ قرآن وسنت کا نام ہے۔ یہ صرف حدود کے نافذ کرنے کا نام نہیں ہے، حدود اسلام کے وسیع تر نظام کا ایک جزو ہیں، لیکن کُل نہیں ہیں۔

ہم نے شریعت کے سات بنیادی مقاصد یعنی توحید، عدل، حفظ نفس، حفظ عقل، حفظ دین،

حفظ نسل اور حفظ مال میں سے صرف ایک مقصد اور اصول کو عام فہم مثالوں کے ذریعے ایک عام شہری کے لیے واضح کرنے کوشش کی ہے، بقیہ چھ مقاصد اور اصولوں میں سے ہر ایک وضاحت کا مستحق ہے۔ فی الوقت صرف ایک کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ مغرب اور مغرب زدہ افراد کا شرعی سزاؤں کے پہلو کو مبالغہ آمیز حد تک ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کا مقصد نفاذِ شریعت کے ان پہلوؤں پر پردہ ڈالنا رہا ہے، جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔

نظام کی تبدیلی

آغاز میں یہ بات کہی گئی تھی کہ ملک میں اصلاح کے تناظر میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ایک عادل ڈکٹیٹر یا ایک ظالم عوامی منتخب کردہ نمائندہ میں سے بہتر کون ہوگا؟

حالانکہ اصل سوال یہ ہونا چاہیے کہ دو برائیوں میں کم تر برائی کی جگہ وہ کون سی صفات ہیں، جن کے حامل افراد کو قیادت پر لایا جائے؟ گویا اصل حل دو برائیوں میں سے ایک کو اپنے اوپر مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ اصلاح حال اور تبدیلیٔ نظام ہے۔ جس کے لیے تین بنیادی وسائل ضروری ہیں: ● ایمان ● انسانِ مطلوب اور ● ماحولیاتی وسائل کی مناسب منصوبہ بندی۔ ان وسائل کی تیاری اور فراہمی کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ یہ کام صبر آزما اور مستقل مزاجی کے ساتھ جذبات و احساسات پر قابو رکھتے ہوئے کرنا ہوگا۔ وقتی مسائل میں اُلجھ کر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ترجیحات کا تعین اور حد بندی لازمی ہے۔ نیکی کا فروغ اور غلبہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک کارکن ہو یا قائد، اس کا کردار و عمل اس کے عقیدہ اور دعوت کا عملی ثبوت پیش کر رہا ہو۔ وہ بات کہنا جس پر ایک شخص خود عمل نہ کر رہا ہو، قرآن پاک کی نگاہ میں فسق ہے، جو ایمان کے منافی ہے۔

اصلاحِ حال صرف اسی وقت ہوسکتی ہے جب نفاذِ شریعت اور اقامت دین کے اس عام فہم تصور کو ہر باشعور شہری کے ذہن نشین کرا دیا جائے تاکہ وہ دل کی آمادگی کے ساتھ نفاذِ شریعت اور اقامت دین کی جدوجہد میں رضاکارانہ طور پر شامل ہو اور ہر بستی اور وادی میں نیکی، خیر، فلاح اور سعادت کا پرچم لہرائے۔ تحریک اسلامی جب اقامت دین کی بات کرتی ہے تو اولاً اس کی مراد اصلاحِ عقیدہ یعنی زندگی میں توحید کے اثرات کا ظاہر ہونا ہے۔ اگر زبان سے تو لا الٰہ الا اللہ کہا لیکن تمام اُمیدیں بیرونی قرضہ جات سے وابستہ ہیں اور اسے رزق دینے والا تسلیم کیا جا رہا ہے،

تو یہ عقیدۂ توحید کے منافی عمل ہے۔تحریک کی پہلی ترجیح اپنے کارکنوں اور تمام انسانوں کے عقیدہ کی اصلاح ہے اور اصلاح کی روشنی میں معیشت اور سیاست کے دیوتاؤں کی جگہ اللہ ربّ العالمین کی حاکمیت کا نفاذ ہے۔

جہاں تک سوال قیادت کا ہے، یعنی موروثی سیاست اور قوت کے استعمال سے اداروں پر قبضہ کرنے والوں میں سے ایک کا انتخاب، تو دونوں طریقے مقاصد شریعت کے منافی ہیں۔قرآن وسنت کسی فوجی یا غیرفوجی یا پارلیمانی آمر کو حاکمیت کا حق نہیں دیتے۔اس کے مقابلے میں بغیر کسی دباؤ کے آزادی کے ساتھ ایک امانت دار، متقی، صاحبِ علم وعمل اور دینی فراست اور انتظامی صلاحیت رکھنے والے فرد کو عوامی انتخاب کے ذریعے ذمہ داری سونپنے کا نام نفاذِ شریعت کی سمت ایک سفر ہے۔اسلام نے اس بات کو بہت آسان بنا دیا ہے۔قرآن وسنت کی جانب سے یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ اپنی امانتیں، امانت دار افراد کے سپرد کرو کیوں کہ یہی کامیابی کا راستہ ہے۔اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو فتنہ وفساد، ظلم اور استحصال کا ہونا فطری امر ہے۔

اگر ایک دیہاتی سے بھی یہ سوال پوچھا جائے کہ اگر ہم نے ایک شخص کو پانچ سال دن رات طبّ کی تعلیم وتربیت دے کر اسے سکھایا ہے کہ انسانی جسم کے اعضاء کس طرح کام کرتے ہیں اور کس طرح انھیں صحت مند رکھا جاسکتا ہے؟ پھر کم از کم دو سال کسی ہسپتال میں مصروف رکھ کر عملاً مریضوں کے مسائل کو سمجھنا اور ان کا حل کرنا سکھایا ہے۔لیکن اگر اس سات سالہ تعلیم وتربیت کے بعد ہم اسے فوج کے سربراہ کے طور پر مقرر کر دیں تو کیا ایک کم پڑھا لکھا شخص بھی اسے سمجھ داری قرار دے گا؟ اور سمجھے گا کہ ایک میڈیکل ڈاکٹر ملک کے اندرونی اور بیرونی دفاعی خطرات کو سمجھ کر ملک کا دفاع کیسے کر سکے گا؟ اسی طرح اگر ایک شہری کو جس نے کبھی بندوق بھی نہ چلائی ہو مسلح افواج کا سربراہ بنا دیا جائے تو کیا وہ سرحدوں کا دفاع کر سکے گا؟ کیا کوئی صاحبِ عقل ایسا کارنامہ انجام دے سکتا ہے؟

قرآن وسنت کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ مطلوبہ صلاحیت اور صفات کے بغیر کسی کا حاکم مقرر کیا جانا یا خود حاکم بن جانا امانت کے منافی اور خیانت ہے۔اس لیے گڑھے اور کھائی میں سے کسی ایک کے انتخاب کی جگہ دین کی واضح تعلیمات کی روشنی میں اہلیت، امانت، علم وسیرت وکردار والے

فرد ہی کو ملکی قیادت سپرد کرنا دین اسلام کا تقاضا ہے۔

دین کو اس کے بھیجنے والے نے خود آسان بنا کر بھیجا ہے۔ اس کو بلا وجہ فلسفیانہ اُلجھاؤ میں ڈال کر مشکل بنانا دین کے مقصد اور مدعا کے خلاف ہے۔ 'قیادت کا مستحق کون ہے؟' جیسا سوال قرآن نے ایک لفظ سے حل کر دیا ہے کہ اس کا اہل ہونا شرط ہے (امانتیں ان کے اہل کے حوالے کرو)، اور جو اہل نہ ہو اس کا کسی ذمہ داری کو قبول کر لینا یا اسے ذمہ داری سپرد کرنا دونوں اسلام سے واضح انحراف ہے۔ جب بھی دین سے انحراف کیا جائے گا نتائج منفی اور نقصان دہ ہوں گے اور جب قرآن کی ہدایت پر عمل ہوگا اور قیادت اہلیت رکھنے والے افراد کو جو اللہ کے خوف، سیرت و کردار کے لحاظ سے صرف اللہ کے احکامات پر عمل کرنے والے ہوں، وہ خود عہدے کے طالب نہ ہوں، تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے عدل، سکون، تحفظ اور ترقی قوم کا مقدر ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن وسنت کے عالمگیر اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے اور ان کے مملکت میں نفاذ کا نام شریعت کی حکومت ہے۔ مسلمان مفکرین اور فقہاء نے بادشاہت اور آمریت دونوں کو یکساں برائی قرار دے کر صرف کراہت کے ساتھ، فتنہ اور فساد سے تحفظ کی حد تک گوارا کیا ہے۔

تحریکاتِ اسلامی دعوتی، اصلاحی اور اجتہادی تحریکات ہونے کے سبب عسکری قوت کی جگہ قوتِ ایمانی اور کردار اور سیرت کی تعمیر کے ذریعے وہ تبدیلی لانا چاہتی ہیں، جو اندر سے ہو، دیرپا ہو اور دستور و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کی جائے۔ یہ عام انقلابی تحریکات کی طرح محض قوت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتیں۔ اس بنا پر ان کے اہداف طویل المیعاد ہوتے ہیں۔ فوری تبدیلی کی جگہ بتدریج تبدیلی ان کا شعار ہے۔ یہی چیز پروگرام، اہداف اور حکمت عملی پر غالب رہنی چاہیے۔

نیکی اور بدی کی کشمکش میں عام آدمی کا رویہ

انسانوں میں ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو بدی ہی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس کے علَم بردار بن کر کھڑے ہوں، اور ایسے لوگ بھی کم ہوتے ہیں جنھیں نیکی سے عشق ہو اور اسے قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان عام انسان نیکی اور بدی کے ملے جلے رجحانات رکھتے ہیں۔ وہ نہ بدی کے گرویدہ ہوتے ہیں اور نہ نیکی ہی سے انھیں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے کسی ایک طرف جھک جانے کا انحصار تمام تر اس پر ہوتا ہے کہ خیر اور شر کے علَم برداروں میں سے کون آگے بڑھ کر انھیں اپنے راستے کی طرف کھینچتا ہے۔

اگر خیر کے علَم بردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو، تو لامحالہ میدان علَم بردارانِ شر ہی کے ہاتھ رہے گا اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علَم بردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں، تو عوام الناس پر علَم بردارانِ شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا، اور اس میدان میں نیک انسانوں کو بُرے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔

سچائی کے مقابلے میں جھوٹ، ایمان داری کے مقابلے میں بے ایمانی، اور پاک بازی کے مقابلے میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگائے، آخری جیت بہرحال سچائی، پاک بازی اور ایمان داری کی ہوگی۔

سیّد ابو الاعلیٰ مودودی

(خیر خواہ)

(بناؤ اور بگاڑ)

اسوۂ حسنہؐ

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلی مرتبہ یہ انقلاب برپا کیا تھا وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا تھا، اور اسی کے اختیار کیے ہوئے طریقے کی پیروی کر کے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے، مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے۔

● **معجزہ:** وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقت ور شخصیت، وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لاسکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے معجزہ ہے۔ جس کی نظیر ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دُنیا کے سامنے آچکی ہے۔

● **اسوہ:** اس نمونہ کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی، اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اس پہلے انقلاب سے اتنے زیادہ اقرب ہوں گے جو اصل نمونہ کی طاقت سے برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے۔

بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی، ہندستان ہو یا امریکا یا روس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں بشرطیکہ اسی اسوۂ حسنہؐ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی

(تنقیحات)

(عطیۂ اشتہار: صوفی بابا)